ماہر القادری مرحوم ــــ نقوش و تاثرات

مرحوم ماہر القادری صاحب کو میں نے نصف صدی بلکہ اس سے بھی چند سال قبل اپنی ابتدائی جوانی میں سابقہ ریاست رامپور کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ حیدر آباد دکن سے آئے تھے۔ اہل علم و ادب جانتے ہیں کہ دہلی اور پھر لکھنؤ کی انگریزوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد رامپور شعر و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ یوں تو اس سے قبل غالب بھی جو نواب یوسف علی خان والی رامپور کے استاد تھے، رامپور آکر رہ چکے تھے اور پھر وہ نواب کلب علی خان کے عہد میں بھی رامپور آکر رہے۔ لیکن لکھنؤ کی تباہی کے بعد جب امیر مینائی، اسیر اور جلال وغیرہ جیسے مشہور شعراء و اساتذۂ سخن نے رامپور کو اپنا مسکن بنایا اور والیان ریاست نے ادب نوازی اور علم پروری کو اپنا شعار بنایا تو رامپور شعر و ادب کا تیسرا مرکز بن گیا اور وہاں شعر و سخن کا ایسا چرچا ہوا کہ غالباً ہر چوتھا پانچواں شخص شاعر یا شعر فہم بن گیا۔ میرے مرحوم بڑے بھائی بھی شاعر تھے اور عشرتی تخلص کرتے تھے۔ خدا کا شکر کہ عہد جوانی میں زندگی میں ایک دینی انقلاب اور پھر عربی زبان و دینی علوم کی طرف توجہ کے سبب میں اس سے محفوظ رہا ورنہ شعر گوئی کے "جراثیم" میرے اندر بھی موجود تھے۔ میرے خیال میں ایک خاندان میں ایک شاعر ہی کافی ہے۔

بہرحال گھریلو ماحول اور رامپور کی عام شاعرانہ روش کے سبب مشاعروں میں شرکت کا شوق مجھے اپنے گھریلو بھائیوں کی طرح بچپن ہی سے تھا اور تقسیم ہند سے قبل رامپور کے مختلف آل انڈیا اور دیگر گھریلو مشاعروں میں میں نے جن مشاہیر شعرائے برصغیر کو دیکھا اور سنا ان میں جگر مراد آبادی، جوش، ماہر القادری، سائل دہلوی، قلمبند داغ، نوح ناروی، روش صدیقی، جذبی، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، جاں نثار اختر، فراق گورکھپوری، مجاز، اقبال صفی پوری وغیرہ بیسیوں شعراء اور پھر رامپور

کے شعراء میں شاد عارفی، محشر عنایتی، سحر رامپوری، محمد علی خان اثر اور شرف زیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میری خوش قسمتی کہ ان مشہور شعراء میں دو کے ساتھ، جو میرے بزرگوں میں تھے، بعد کو میرے گہرے مراسم بھی قائم ہوئے اور مجھے ان کی شفقتیں، رفاقتیں اور عنایات بھی حاصل ہوئیں۔ ان میں پہلے جگر مرحوم اور دوسرے ماہر القادری مرحوم تھے۔ جگر صاحب کی تو میزبانی کا شرف بھی مجھے مکۂ مکرمہ میں حاصل رہا اور بعض عرب ادباء کے سامنے مجھے ان کی غزلوں کے ترجمے کا بھی موقع ملا۔ جب وہ سن ۱۹۵۳ء میں حج کے لئے آئے تھے اور میں مکۂ مکرمہ میں تین سال سے مقیم تھا۔

ماہر القادری صاحب سے میرا پہلا تعارف فروری سن ۱۹۵۵ء میں ہوا جب میں حجاز مقدس اور مصر کے اپنے پہلے پانچ سالہ سفر کے بعد پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ اس تعارف میں مرحوم مولانا ظفر انصاری کی عنایت شامل تھی جن سے پہلی بار حرم شریف (مکۂ مکرمہ) میں سن ۱۹۵۱ء میں نیاز حاصل ہوا تھا اور پھر یہ تعلق تقریباً چالیس سال تک قائم رہا۔

ماہر صاحب نے اپنے فلیٹ میں جو گارڈن ایسٹ میں تھا، مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ بچپن میں جن ماہر صاحب کو میں نے دیکھا اور سنا تھا وہ بے ریش و جواں سال تھے اور جب اس موقع پر ان کو دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک خوش نما مختصر داڑھی تھی لیکن مجھے ان کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ ماہر صاحب اس نوجوان کے ساتھ بہت محبت اور یگانت کے ساتھ ملے جو اس دور میں حجاز و مصر میں طویل عرصے رہ کر واپس آیا تھا جب اس وقت نہ وہ وہاں گئے تھے اور نہ جماعت اسلامی کے دیگر اصحاب (بشمول مرحوم مولانا مودودی) میں سے کوئی گیا تھا سوائے چوہدری غلام محمد مرحوم کے۔ ان کی نوازش و توجہ مجھ پر اس لئے دو چند تھی کہ مصر میں میرا اخوان المسلمین کے ساتھ گہرا ربط رہا تھا اور میری آمد سے چند ماہ قبل ہی مصر میں اخوان بڑے سخت ابتلاء اور قید و بند اور پھانسیوں کے

جاں گسل و المناک مراحل سے گزرے تھے جن میں میرے بعض نوجوان مصری احباب بھی تھے ۔ میں خوش قسمتی سے بچا رہا ۔ اگرچہ قاہرہ کی ایک مسجد میں جمال عبدالناصر کی پولیس کی فائرنگ کے وقت میں وہاں موجود تھا ۔ اس لئے اس محفل میں شعر و ادب سے زیادہ ماہر صاحب ، مولانا ظفر انصاری اور ان کے فرزند ظفر اسحاق انصاری کی طرف سے اخوان المسلمین اور ان کی تحریک سے متعلق سوالات کے میں جوابات دیتا رہا ۔ ماہر صاحب اس وقت سے ہی جماعت اسلامی کے مؤیدین و ہمدردوں میں شامل تھے اور جماعت بڑی حد تک اخوان سے مماثلت رکھتی تھی (گو جماعت کے افراد میں اخوان المسلمین جیسی عمومی اسلامی مودت و اخوت اور یگانگت کا فقدان تھا) اس لئے اس سے متعلق افراد کا اخوان کے حالات کے بارے میں جویا ہونا ایک طبعی امر تھا ۔

پھر ماہر صاحب سے دوسری بار میرا مضبوط اور مستقل تعلق دس سال بعد سن ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا جب میں اپنے دوسرے طویل سفر یعنی دمشق و کیمبرج میں اپنی باقاعدہ تعلیم اور ریاض کی کنگ سعود یونیورسٹی کی دوسالہ ملازمت کے بعد واپس آیا ۔ یہ بھی دو ماہ کا مختصر وقفہ تھا کیونکہ اس کے بعد میں لیبیا یونیورسٹی میں ملازمت کے لئے چلا گیا تھا ۔ بہرحال اس وقت ماہر صاحب ناظم آباد کے اپنے ایک بنگلے میں منتقل ہوچکے تھے ۔ یہاں پھر انہوں نے میری ایک پر تکلف چائے کی دعوت کی جس میں ان کے اور کچھ احباب بھی مدعو تھے ۔ اس کے بعد سے یہ تعلق استوار ہوتا چلا گیا ۔ میں بن غازی یونیورسٹی لیبیا چلا گیا تھا ۔ ماہر صاحب عنایت کرتے تھے اور مجھے اپنا مجلہ فاران پابندی سے بھیجتے تھے اور جب میں ہر سال یا دوسال بعد موسم گرما کی تعطیلات میں کراچی آتا تھا تو زمرۂ شعراء و ادباء میں سے ماہر صاحب ہی وہ تنہا شخص تھے جن سے ملاقات رہتی تھی اور اس طرح ان سے گہرا قلبی تعلق قائم ہوگیا اور مجھ پر ان کے فکری و اخلاقی جوہر کھلتے گئے ۔

شاعر و مصنف اور ماہر زبان کی حیثیت سے تو ان کو بہت سے لوگ جانتے تھے ۔

لیکن مجھ پر ان کی انسانی ہمدردی کا وصف ایک ذاتی معاملے میں کھلا جس پر وہ غالباً حدیث نبوی " کان اللّٰہ فی عون العبد ماکان العبد فی عون اخیہ " (یعنی جب تک کوئی بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اللّٰہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے کے مطابق عامل تھے) تفصیل اس کی یہ ہے کہ میں نے اپنی بیرون ملک کی کمائی سے ایک ہزار گز پر ایک بنگلہ فیڈرل بی ایریا میں بنایا تھا ۔ جیسے ہی سن ۱۹۷۱ء میں بمشکل تمام یہ بن کر تیار ہوا ، بھٹو صاحب کے عہد میں حکومت نے اس پر ریکیوزیشن Requisition کے نام سے قبضہ کرلیا اور اس میں گلبرگ تھانہ بنادیا ۔ میں ہر سال دوسال تعطیلات میں واپس آکر اس کی واگزاشت کی کوشش کرتا رہا مگر بے سود ۔ ماہر صاحب کو معلوم ہوا تو وہ مجھے ذوالفقار علی بھٹو دور کے مشہور انسپکٹر جنرل پولیس فضل حق صاحب کے پاس خود لے کر گئے ۔ بغیر کسی سابق Appointment کے ۔ میں نے دیکھا کہ ان آئی جی صاحب نے جو بڑے جابر مشہور تھے ، جلد ہی دوسرے منتظرین کو چھوڑ کر ماہر صاحب اور مجھے باریابی بخشی ، چائے سے ہماری تواضع کی اور میری کہانی سننے کے بعد درخواست پر فوراً کے سرخ قلم سے حکم جاری کردیا کہ رضوان صاحب کا بنگلہ فوراً خالی کردیا جائے اور تھانہ کہیں اور منتقل کردیا جائے ۔ ساتھ ہی ڈی آئی جی معین کو ٹیلیفون بھی کردیا ۔

تعلق صرف اتنا تھا کہ بقول ماہر صاحب ان آئی جی صاحب نے کسی مشاعرے میں ان کا کلام سنا تھا اور علیک سلیک ہوگئی تھی کہ وہ خود بھی شاعر تھے ۔ ماہر صاحب نے تو اپنا فرض ادا کردیا تھا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد کو پولیس افسران نے اپنی کارستانیوں کے ذریعہ اس حکم پر عمل روکے رکھا اور میرا گھر نو سال بعد اس وقت خالی کیا جب وہ تقریباً کھنڈر بن چکا تھا اور اس میں سے پولیس والے جھاڑ فانوس ، پنکھے وغیرہ تک چرا کر لے گئے تھے اور پانی و بجلی کے بھاری بل چھوڑ گئے تھے ۔

ماہر صاحب چاہتے تھے کہ میں لیبیا سے واپس آجاؤں اور اپنی صلاحیتوں سے ملک

کی خدمت انجام دوں ۔ سو انہوں نے کسی محفل میں میرا تذکرہ اس وقت کے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر محترمی ڈاکٹر احسان رشید صاحب سے کردیا ۔ ان کے کہنے سے میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے ان کے آفس میں ملا ۔ نہ معلوم ماہر صاحب نے کس تعریف و توصیف سے موصوف سے میرا ذکر کیا تھا کہ وہ انتہائی احترام اور یگانگت کے ساتھ مجھ سے ملے کہ اپنی کرسی چھوڑ کر میرے ساتھ صوفے پر آکر بیٹھ گئے ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کا معمول ہو مگر پاکستان میں اس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا ۔ اس کے بعد زندگی میں دو ہی تجربے ایسے اخلاق کے اور ہوئے ۔ اسلام آباد میں شہریار خان (اس وقت کے ایڈیشنل سیکریٹری) اور کنگ سعود یونیورسٹی ریاض میں اپنے ایک سابق شاگرد کے پاس جو اس وقت فل پروفیسر اور اپنے شعبہ کا چیئرمین تھا ۔

اپنا گھر خالی نہ ہوسکنے اور کوئی ٹھکانہ نہ ہوسکنے کے سبب میں اس وقت ملک واپس تو نہ آسکا لیکن ماہر صاحب کی نوازش اور انسانی ہمدردی کا یہ دوسرا جاں فزا نقش میرے دل پر مرتسم ہوا ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسی ہی ہمدردی اور ذاتی توجہ کا رویہ رکھتے ہوں لیکن میں یہاں اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں ۔

ماہر صاحب مرحوم کو جیسا کہ سب جانتے ہیں .... صحت الفاظ کا بڑا اہتمام تھا اور بڑی بات یہ کہ وہ بایں ہمہ علم و فضل اس جستجو میں منہمک رہتے تھے ۔ آج کے زمانے میں جب ہم صحافت اور ٹیلی وژن میں بے شمار الفاظ کا غلط املا پڑھتے اور سنتے ہیں ۔ جیسے نقص امن ، علانیہ ، عظام اور لسانی ، املاک حکومت ، قمیص ، استثناء ، وغیرہ غلط طور پر نقص امن ، اعلانیہ ، عظام ، لسانی ، املاک حکومت ، قمیض اور استثنیٰ ، وغیرہ لکھے اور بولے جاتے ہیں تو مجھے ماہر صاحب بہت یاد آتے ہیں ۔ ان کی لغوی جستجو کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے میری زبان سے متعدد بار مستقبَل (ب پر زبر کے ساتھ) سنا تو کہنے لگے کہ آپ اس طرح بولتے ہیں ، کیوں ؟ ہم تو اس کو مستقبِل (ب پر زیر کے ساتھ) پڑھتے

اور بولتے ہیں ۔ میں نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے اور عربی میں اس کا ہمارے یہاں کے معروف معنی میں یہی تلفظ ہے اور اسی طرح عربوں کو میں نے بولتے سنا ہے کہ مستقبَل اسم مفعول ہے اور یہ آئندہ زمانے کو کہتے ہیں ۔ جبکہ مستقبِل (ب کے زیر کے ساتھ) اسم فاعل ہے ۔ اور یہ استقبال کرنے والے کو کہا جاتا ہے ۔ ان معلومات سے وہ مطمئن اور خوش ہوئے اور انہوں نے مجھ سے کوئی تکرار نہیں کی ۔

اسی طرح انہوں نے مجھ سے ایک لفظ کے بارے میں جو اب مجھے یاد نہیں، پوچھا کہ گھروں میں آپ کے یہاں عورتیں اس کو کس طرح بولتی ہیں ۔ میں نے اپنی والدہ کے حوالے سے بتایا تو انہوں نے اس لفظ کی صحت کی تصدیق کرلی ۔

ماہر صاحب اگرچہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں مولانا ماہر القادری کے لقب سے مشہور تھے ۔ یہ شاید ان کے فکری و عملی دینی رجحان کی وجہ سے یا ان کی مختصر داڑھی کی وجہ سے تھا ۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ بہت خوش گفتار اور بذلہ سنج انسان تھے ۔ انہوں نے مجھے اپنا ایک لطیفہ سنایا کہ جب وہ حج پر گئے تو جدہ میں انہوں نے کسی پیٹرول پمپ پر لکھا دیکھا " المرکز الحدیث " ۔ وہ اپنی پاکستانی ثقافت کی وجہ سے سمجھے کہ یہاں کوئی حدیث کا مرکز ہے جہاں حدیث کا درس ہوتا ہے ۔ (ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حدیث کے معنی ماڈرن کے بھی ہیں) ۔ کہنے لگے کہ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی اور کچھ انگریزی میں پیٹرول پمپ کے مالک سے کہا کہ ہمیں بھی حدیث نبوی کا شوق ہے ۔ کب یہاں درس ہوتا ہے کہ ہم بھی یہاں حاضری دیں ۔ وہ عرب حیران ہوا اور اس نے اشاروں کنایوں سے بتایا کہ یہ ایک ماڈرن پیٹرول پمپ اور ورکشاپ ہے ۔ یہاں حدیث کا درس نہیں ہوتا ہے ۔

ان کی اس خوش مذاق طبیعت اور اس صنف سخن سے دلچسپی کا جس کو مطایبات کہتے ہیں، مجھے ایک یادگار تجربہ ہوا ۔ عربی میں اس کو مُلَح کہتے ہیں ۔ (میم پر پیش اور لام پر زبر

کے ساتھ) تقریباً پچیس سال کے انقطاع کے بعد وہ مجھے ایک نجی مشاعرے میں لے گئے۔ ناظم آباد سے وہ شان الحق حقی صاحب کی کار میں مجھے شہید ملت روڈ سے لینے آئے۔ مشاعرہ ایک صنعت کار طالب رسول صاحب کے یہاں تھا۔ پی ای سی ایچ ایس کے بلاک ۶ میں۔ اس میں صرف پچیس تیس حاضرین تھے۔ پرتکلف عشائیہ کے بعد لان میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہیں پہلی بار میری اسماعیل مینائی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں کشور ناہید کو بھی پہلی اور آخری بار دیکھا۔ یہ غالباً سن ۱۹۷۲ء یا ۷۳ء کی بات ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تقریباً تیس سال کے بعد میں نے اس مشاعرے میں راز مراد آبادی ایم اے علیگ کو دیکھا۔ جن سے تعارف اگر نہیں کرایا جاتا تو شاید ان کو نہ پہچان پاتا۔ بہرحال ان کو دیکھ کر میری زبان حال پر تھا "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا" ہو بھی گئی، کیونکہ تیس سال قبل رامپور کے ایک مشاعرے میں دیکھے ہوئے اس خوبرو نوجوان کے سر کے بال اب غائب تھے، توند نکلی ہوئی تھی۔ ابتدائے جوانی میں سنی ہوئی ان کی غزل کے مطلع کا مصرع اولین اب تک مجھے یاد ہے "جلوہ فرما ہے کوئی ماہ مبیں آج کی رات" اور پھر اس غزل کا یہ شعر۔

نغمہ و مے کا یہ طوفان تلاطم اللہ
گھر ہوا ہے مرا خیام کا گھر آج کی رات

یہاں مشاعرے کے دور اولیں کے بعد جب کچھ لوگ اور خاتون شاعرہ رخصت ہوگئیں اور گنے چنے لوگ رہ گئے تو میں نے زندگی میں پہلی بار بعض ثقہ اور غیر ثقہ معمر شعراء سے ایسی غزلیں سنیں جیسی میں نے کافی عرصہ پہلے سن ۱۹۶۱ء میں کیمبرج میں اتفاق سے جعفر زٹلی کے دیوان میں پہلی بار پڑھی تھیں۔ لیکن اس مہذب محفل میں مینائی صاحب اور ماہر صاحب و دیگر حضرات کی زبان پر فحش کلمات نہیں آئے اور اس کے بجائے وہ ڈیش Dash کہہ کر مصرع یا شعر پورا کردیتے تھے۔ انسانی تہذیب کا یہ بھی

ایک عجیب پہلو ہے ۔ عربی زبان میں تو انتہائی سنجیدہ قدیم عربی ادب کی کتابوں میں ایسے بے شمار قصائد و لطائف ہیں جن کو آج ہم اپنی زبان سے ادا بھی نہیں کرسکتے اور یہ فحشیات Pronography کے زمرے میں آتے ہیں بلکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ تک سے ایسے مطابیات مشہور ہیں ۔ وہ اس کو احماض یعنی ترشی یا منہ کا مزا بدلنا کہتے تھے۔ سنجیدہ علمی دروس کے بعد حاضرین سے کہتے تھے " احمضوا " یعنی اب منہ کا چٹخارا لو ۔ اسی طرح فارسی زبان میں ایک قدیم ایرانی شاعر عبید زاکانی کا دیوان ہے جو ایک اعلیٰ پائے کا شاعر و ادیب تھا ۔ اس کے کلیات میں سنجیدہ نثر و نظم کے نمونوں کے ساتھ وہ ادب بھی کافی ہے جس کو اردو میں زٹلیات کا نام دیا گیا ہے اور ہندو تو اس صنف سخن میں سب سے ہی بڑھے ہوئے ہیں ۔

ماہر صاحب مرحوم کو جذب دروں رکھنے والے سچے مسلمان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا ۔ ان کا پر خلوص و اثر انگیز نعتیہ کلام اس کا گواہ ہے اور اسی طرح اسلام و قرآن سے ان کو گہرا شغف تھا ۔ ان کی مشہور نظم " قرآن کی فریاد " اردو شاعری کا ایک شاہکار ہے ۔ ماہر صاحب کا ماہوار رسالہ " فاران " برسوں کراچی سے نکلتا رہا ۔ انہوں نے اپنے اس رسالے کے ذریعے شعر و شاعری سے زیادہ دین و علم کی خدمت کی انہوں نے طالب ہاشمی صاحب کو اپنے اس رسالے کے صفحات مہیا کئے جس میں انہوں نے تواتر کے ساتھ برسوں صحابہ کے سوانح حیات لکھے اور باالآخر ان کو جمع کر کے صحابہ و صحابیأت کے نام سے کتابی شکلوں میں شائع کیا ۔ اسی طرح انہوں نے ایک سابق آئی سی ایس افسر حبیب صاحب سے سائنس میں قدیم مسلمانوں کی خدمات و کارناموں پر تسلسل کے ساتھ مضامین لکھوائے اور پھر اس کو موتمر اسلامی کراچی نے کتابی شکل میں شائع کیا ۔ ان دونوں کتابوں سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا ہے اور پہنچے گا اس کے ثواب میں یقیناً ماہر صاحب بھی شریک ہوں گے ۔ پھر اپنے اسی رسالے میں انہوں نے پرویزی فتنے کا

بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی زندگی اقبال کے اس شعر کی تصویر تھی :-

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شعر و ادب میں ماہر صاحب کا جو اعلیٰ مقام تھا اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں یہاں ان کی ایک شاہکار غزل کے دو شعر ضرور پیش کروں گا جو مجھے رامپور کے اسی یادگار مشاعرے سے یاد ہیں جس میں تقسیم ہند سے پہلے میں شریک تھا اور جس کا ذکر میں نے ابتداء میں کیا ہے۔ ان میں ماہر صاحب نے زندگی کی تلخ حقیقتیں انتہائی رواں اور خوشگوار انداز میں بیان کی ہیں اور یہ اردو شاعری کے اس اسلوب میں ہیں جسے سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ سنئے :-

دل میں کپٹ اور میٹھی باتیں
کیسی دنیا دار ہے دنیا

اور دوسرا شعر تو ایسا حقیقت پسندانہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرع گویا ضرب المثل ہے :-

وقت پڑے تو کام نہ آئے
لکڑی کی تلوار ہے دنیا

اور اسی قدیم مشاعرے میں، میں نے ان سے ان کی مشہور نظم " ماستا کی لاش " بھی سنی تھی جس میں انہوں نے ایک دیہاتی " سروپی لال " کے دولت کمانے کے لالچ میں شہر آنے اور پھر اس کی موت کی عبرتناک اور بڑی حقیقت آمیز داستان نظم کی ہے اور ساتھ ہی ان کی ایک دوسری رومان پرور نظم " گنگا کے کنارے "۔

تقریباً تیس سال کے بعد ایک بار موسم گرما کی تعطیلات میں جب میں کراچی آیا ہوا تھا تو میں نے اپنی قیام گاہ پر ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور فرمائش کر کے ان سے

یہ دونوں نظمیں سنیں جو انہوں نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ سنائیں اور میں نے ان کو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرلیا ۔ اس کو بھی اب بیس سال سے زائد ہو چکے ہیں ۔

ماہر صاحب کو ان کی دینداری ، نیک نیتی ، خلوص اور دین سے سچی لگن کا یہ انعام ملا کہ ان کی وفات حجاز مقدس میں ہوئی اور مکہ مکرمہ کا مشہور متبرک قبرستان جنۃ المعلاۃ ان کا آخری مرقد بنا ۔ یہی وہ مبارک قبرستان ہے جہاں ام المومنین حضرت خدیجہؓ اور بعض دیگر صحابہ و بزرگان دین کی قبور ہیں ۔ سیرت نبوی پر اپنی کتاب " دریتیم " کے مصنف ماہر القادری مرحوم یقیناً ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لئے شاعر نے " خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را " کی دعا کی ہے ، ہم سب اس دعا میں شریک ہیں ۔

افسوس یہ ہے کہ اپنی تنہائی طویل مسافرانہ زندگی کے بعد جب میں مستقل طور پر وطن واپس لوٹا تو میرے یہ مخلص بزرگ اور دوست اس دارفانی سے دار بقا کو ہمیشہ کے لئے جا چکے تھے ۔ میری زبان پر قدیم عربی شاعر کا یہ شعر تھا ۔

اذا زرت ارضاً بعد طول اجتنابها

فقدت صدیقی و البلاد کماهیا

(جب میں طویل گریزپائی کے بعد اپنی سرزمین واپس آیا تو ملک تو ویسا ہی تھا لیکن میرا دوست دنیا سے جا چکا تھا) ۔